پروفیسر محمد سلیم میمن

شاہ لطیف: اتحاد و اخوت کے پیمبر

Abstract:

Shah Latif – Symbol of Unity & Brotherhood

Shah Abdul Latif Bhitai (1689-1752) is a multidimensional person, well-versed in the art of writing poetry. His Risalo is complete code of life, well preserved and presented, both in sublimity and universality.

His vision is infinite, he has witnessed the celestial beauty as well s glimpses of earthly treasures of vales and dales, mountains and Rivers along with the living being viz: men, women, birds and beasts and almost all creatures were captured by his vision and have all those been preserved in his poetry.

Shah Latif has portrayed the lives of most delicate creatures of earth i.e. women folk; who love the mother earth in the character of Marui, the symbol sacrifices and courage to face the facts, troubles and tortures of life and its hardships in the character of Sassui, who challenges those hardship with courage and magnanimity.

Shah Latif is a universal poet, his status and poetry is of such an stature that it can be presented in competition of world poetry. His language and style is marvelous. It deeply touches the heart and soul of reader. He praises the creator of the universe and with his art, becomes the creator on earth along with all beauteous places and persons with clear, kind and merciful minds who dwell on the mother earth in all simplicity, honesty, pity and love for all creatures dwelling on this earth.

Latif is in all praise for working class, both man and woman in his poetry, that is why his poetry creates the seat of Love in heart of all the human beings, may he be, sea-farer, cobbler, kinsman and the farmer. He encourages all the working class persons to work hard and achieve the goal of their lives and pass the days in comfortable and peaceful manner.

سندھ کے عظیم شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی (1752-1689) ایک ہمہ جہت شخصیت و مفکر تھے۔ ان کے افکار و خیالات کی عظمت سے ان کی شاعری نے وہ مقام و مرتبہ حاصل کیا ہے کہ انہیں دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر اور تخلیقی دانشور کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ شاہ بھٹائی جیسی شخصیات روز پیدا نہیں ہوتیں، ان کا ہونا انسانی معاشرے کے لئے کسی معجزے سے کم نہیں۔ یہ معجزہ ہی تو ہے کہ شاہ صاحب دورِ تصوف اور کلاسیکی عہد کے شاعر ہیں، لیکن ان کے ہاں لا محدود علمی و فکری زاویئے ہیں، جنہیں دورِ جدید کی آگہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی جیسے عظیم شعراء کو فطرت کی طرف سے غیر معمولی بصیرت عطا ہوتی ہے،

وہ اپنی چشمِ بصیرت سے ان حقائق کی گرہ کشائی بھی کر دیتے ہیں، جنہیں کائنات کے اسرار کا نام دیا جاتا ہے۔

شاہ صاحب کی ابتدائی زندگی، خاندانی و تہذیبی ماحول اور زندگی کی صداقتوں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے، ان کے مشاہدے اور مجاہدے نے انہیں ایک ہمہ جہت شخصیت بنا دیا تھا۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی، انسان اور کائنات، روحانیت اور ارضی حقائق کے پیچیدہ راستوں کے مسافر تھے۔ ان کا تخلیقی شعور زمینی بھی ہے اور آسمانی بھی، مقامی بھی ہے اور بین الاقوامی بھی۔ دنیا کے تمام بڑی اور آفاقی شاعری کی طرح، شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری، بنیادی طور پر انسان اور انسان کی گرد و پیش پھیلی ہوئی کارگہہ زیست کی نیرنگیوں کا اظہار کرتی ہے۔ صوفیانہ تصورات اور حقیقتِ اولیٰ کی تلاش بلاشبہ ان کی شعری اور فکری منہاج ہے، لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لئے نہ تو انہوں نے تیرہ و تار غاروں میں چلہ کشی کی، اور نہ انسانوں سے دامن چھڑا کر، جنگل اور بیابانوں کی خاک چھانی، بلکہ آس پاس کی بکھری ہوئی زندگی سے معنویت اور نیرنگیوں کے جوہر تلاش کر کے، سندھ کے مفلوک الحال عوام کے درمیان حقیقتِ اولیٰ سے فیض حاصل کیا۔ ان کی شاعری میں جس ہمہ گیر وسعت، پھیلاؤ، تنوّع، رنگارنگی اور تکثیریت کی جلوہ سامانی ہے، وہ زندگی کے حقیقت آشنا تناظر کی دین ہے۔ ان کا کلام بلاشبہ سندھی زبان، شاعری، ثقافت کا نقطہء عروج ہے، جس میں سرزمینِ سندھ کا دل دھڑکتا ہے۔ ان کی شاعری میں شاید ایسا کوئی بیت یا وائی ہو، جس میں دھرتی کی بھینی خوشبو، نہ مہک رہی ہو۔

فقط سِر دے کے کب ہوتا ہے سودا، نہ سمجھ اتنا ارزاں عاشق کو
یہ نعمت اے ہجومِ سر فروشاں، مقدر ہی سے ملتی ہے کسی کو

سندھ کے ریگستانوں، میدانوں، ٹیلوں، پہاڑوں، ندی نالوں، جھاڑیوں، جنگلوں، تالابوں اور کھیتوں کھلیانوں کے جو رواں دواں منظر ان کے کلام سے ابھرتے ہیں، ان میں سے بہت سے اہم اور فعال کردار انسانوں کے ہیں اور شاید ہی کوئی داستان ایسی ہو، جس میں انسانی واردات کا کوئی نہ کوئی پہلو نمایاں نہ ہوا ہو۔ ابھی آپ زندگی کے بھرپور منظر سے گزر ہی رہے ہوتے ہیں کہ اگلے موڑ پر ایک دوسرا منظر نگاہوں کو متحیر کرنے لگتا ہے اور ہر منظر کے ساتھ سوادِ منظر بھی بدل جاتا ہے۔ موج در موج تموج کی ایک لہر ابھی ریگِ ساحل پر جذب نہیں ہو پاتی کہ دوسری لہر دریائے حیات کو ایک نئی صورت گری سے دوچار کر دیتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو 'شاہ جو رسالو' شاعری کی ایک عام کلیات نہیں بلکہ ان کے بارے میں تو شاہ صاحب نے خود کہا ہے کہ:

ان کو مت ابیات سمجھ، ہیں آیات قرآن
دھیان سے گر تو پڑھ لے تو، ہو پریتم کا عرفان
(آغا سلیم، ص: 273)

شاہ سائیں کی شاعری دراصل عام مفلوک الحال لوگوں کی سرگزشت ہے۔ دکھ درد، جذبات اور احساسات کی متحرک تصویریں ہیں اور ان کے عکس ہیں۔ ان کے کلام کو نہ تو محض فلسفے اور منطق کی کسوٹی پر

Shah Abdul Latif Bhitai Chair

رکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی تصوف کی نکتہ وری تک محدود کیا جا سکتا ہے، بلکہ وہ آس پاس اترے ہوئے سب موسموں، رنگوں اور کیفیتوں کو کسی نہ کسی قصے، سرگزشت اور انسانی کرداروں کی حقیقت اور حسی وارداتوں کی صورت میں بیان کر دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں وادیٔ سندھ کے دیہاتوں، کسانوں کے جھونپڑوں، کھیتوں کھلیانوں، مچھیروں، ملاحوں کی بستیوں کے آثار پھیلے ہوئے ہیں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں:

یہ بحری تاجروں کا کارواں ہے، نہ جانے کس گھڑی لنگر اٹھائے
نہیں کچھ اعتبار ان تاجروں کا، جہاز ان کا روانہ ہو نہ جائے
انہیں سوئے دیارِ موجِ و طوفاں، ھوائے آبگوں اکثر بلائے
ترے حق میں غنیمت یہ گھڑی ہے، کہ پھر یہ ہاتھ آئے یا نہ آئے
(شیخ ایاز، ص 213)

☆☆☆

گھر کے مانوس و دل نشیں منظر، اب مجھے اجنبی سا پاتے ہیں
اور پھر یک بیک نہ جانے کیوں، ڈوبنے والے یاد آتے ہیں
(شیخ ایاز، ص 417)

شاہ کی شاعری سے بھرپور لطف اندوز ہونے اور اس کو احساس کی اتھاہ گہرائیوں تک جذب کرنے کے لئے موسیقی سے، قاری کی واقفیت بیحد ضروری ہے، کیونکہ شاہ لطیف کی شاعری صرف اپنے الفاظ اور مصرعوں کے ذریعے ہی نہیں بلکہ ان میں پوشیدہ سُروں کے ذریعے بھی اپنا ابلاغ کرتی ہے۔ شاہ کی شاعری میں موسیقی کا اتنا عمل دخل ہے کہ ان کے رسالے کے ابواب سُروں میں ڈھلے ہوئے ہیں اور ہر سُر کو گائے جانے کے اوقات کو سامنے رکھیں تب ہی ان کے متعلقہ ابواب میں بیان کردہ داستانیں اور ان میں اختیار کردہ لہجے کے اتار چڑھاؤ اپنی اصل معنویت اور حسن کو ہم پر واضح کرتے ہیں۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی سندھی قوم کے استاد، ہادی اور رہبر تھے۔ انہوں نے سندھی قوم کو اپنا رسالہ عطا کر کے انہیں اہل کتاب ہونے کا شرف بخشا، اور اس میں کوئی شک نہیں، بلکہ یہ حقیقت ہے۔ 'شاہ جو رسالو' دنیا کے تمام مذاہب کے تعلیمات کا نچوڑ اور سنگم ہے اور سندھی تہذیب کی مجموعی حاصلات کا روح بھی۔ اس میں زند اوستا، گیتا، بدھ دھرم، جین مت، مسیحیت اور اسلامی تعلیم کے اہم اور اعلیٰ اصول اور اقدار موجود ہیں، جن میں ویسے بھی کئی قدریں مشترک ہیں۔ ان کے کئی سُر علیحدہ علیحدہ اور جزوی یا مکمل طور پر ان مذاہب کے اپنے تربیتی ماحول و تعلیمی اصلاح پر مشتمل نظر آتے ہیں۔ ان میں سندھی تہذیب کی ہزاروں برس پرانے روحانی تجربات و روایات سے آگہی موجود ہے۔ سندھی تہذیب نے جُگوں سے اپنی روایات و ثقافت کو لوک کویتاؤں، لوک کتھاؤں اور کہاوتوں کے ذریعے محفوظ رکھا ہے۔ انہیں تجربات، واقعات کے مطالعے سے اخذ

کئے ہوئے عام نتائج و اصول شاہ سائیں نے اپنے رسالے کے ذریعے عام لوگوں تک پہنچائے ہیں اور ان کی رہبری و رہنمائی کی ہے، اور شاہ سائیں نے اپنے رسالے کے ذریعے سندھ کے لوگوں کو ان کے ہی اصطلاح میں، ان کے ہی مثالوں، واقعات اور باتوں سے سچ، نیکی اور حسن سے محبت کے جذبے سے آشنا کیا ہے۔

درد ہی درد ہے، دوا کیسی، کیا ہے یہ ماجرا کسے معلوم
حاصلِ عشق کوئی کیا جانے، ابتدا ہے نہ انتہا معلوم

شاہ صاحب کا اپنے ملک کے غریب، بیکس اور مسکین لوگوں سے بڑا گہرا تعلق ہے اور ان کے لئے اپنے دل میں درد رکھتے ہیں۔ اپنے ایک کردار مارئی کی زبانی اُس کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

بر تو ٹھٹھرے پالوں میں، اور ہو، میرا بستر گرم
کہینگی ساری سکھیاں تجھ کو، آئی سکھی نہ شرم

☆☆☆

مارو نے جو دھاگے باندھے، ھر دھاگہ زرتار
ریشم سے نہ للچا مجھ کو، میں صحرائی نار
مارو میرا سنگھار، میں کیسے ھار سنگھار کروں

مندرجہ بالا بیت میں شاہ صاحب کا موجودہ دور کے لوگوں کے لئے بھی پیغام ہے کہ اپنے ہم وطنوں کا احساس کریں، ان کی تکالیف اور دکھ درد کو محسوس کریں اور انہیں دکھ دیکر سکھوں کا سودا نہ کریں۔

مارئی جیسی مسکین اور مفلوک الحال عورت، عمر بادشاہ کی نرم اور گرم رضائی کو اوڑھنے سے انکاری ہوتی ہے، کیونکہ اس کا محبوب شوہر تو ریگستانوں کی خنک اور سرد راتوں میں، بغیر کچھ اوڑھے پڑا ہوا ہے، اور نہ ہی وہ عمر بادشاہ کے مشروبات کو قبول کرتی ہے، بلکہ اپنے پیاروں کی طرح پیاسے رہنے کو ترجیح دیتی ہے۔ یہ ایک ایسا احساس ہے جو اپنے لوگوں سے محبت، اور اتحاد کی علامت ہے، تو دوسری جانب شاعر، حب الوطنی، انسان دوستی کی علامت کے طور پر بھی استعمال کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔

لطیف کے کلام کے تخلیقی عناصر، جنہیں انہوں نے اپنے تاریخ کے ادوار سے اخذ کیا ہے، وہ ہر دور میں کارفرما ہیں۔ وہ کل ہو یا آج، ان کے کلام کی گوناگوں خوبی ہے کہ جس سے ہم درس حاصل کر کے انفرادی و اجتماعی طور پر کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں، شاہ لطیف کو محض ایک شاعر، حقیقت و مجاز، ظاہر و باطن کا پیمبر تصور کیا گیا تو پھر وہ دائمیت والی کیفیات، جس کا تعلق سماج اور اس کے نظام سے ہے، فرد اور اجتماعی زندگی سے ہے، وہ ختم ہوتا نظر آئیگا۔

دور، وقت اور زمانہ نہایت ہی بامعنیٰ الفاظ ہیں، جس میں خاص محدودیت ہوتے بھی لامحدودیت ہے۔ سب سے پہلے تو دیکھنا پڑے گا کہ دور، وقت کی نسبت میں ہے، یا وقت دور کا تعین کرتا ہے؟ یا دونوں کا زمانے سے کوئی تنازعہ ہے۔

موجودہ دور کی اصطلاح ایک خاص قسم کی دلالت کرتا ہے، جس سے آج کا انسان گزر رہا ہے، جو

ایک سماجوادی نظام کی صورت میں بھی موجود ہے، تو ایک سماجی قوت اور سماجی عمل کی صورت میں بھی موجود ہے۔ موجودہ سماجوادی نظام کے ترکیبی عناصر کیا ہیں، ان کی ہیئت اور اشکال کیا ہیں، وہ کس طرح سے عمل پذیر ہے، اس کے لئے کسی بھی تشریح کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ انہیں ترکیبی عناصر میں سماجوادی نظام کا دائرہ کار موجود ہے، جس میں اقتصادی، سیاسی، اخلاقی، مذہبی، ثقافتی، سائنسی غرض کہ سب حالات کارفرما ہیں، جس سے وادیءِ سندھ کے لوگ دوچار ہیں۔

شاہ لطیف، جو اس سماج کی بنیادی تعمیر کرنے کے لئے ایک رہبر، ایک مفکر اور ایک محافظ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے افکار اور شعور کی روشنی لوگوں کو کونسی راہ دکھاتی ہے، یہ فرض ہمارے دانشوروں کا ہے کہ وہ شاہ لطیف کے فکر اور اس کے فلسفے کی روشنی میں لوگوں کی رہنمائی کریں، لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ ہمارے پاس حقیقت پسندی کے بجائے دوغلے پن کو اپنایا گیا ہے۔ ایسے حالات کی روشنی میں فرماتے ہیں:

سٹ پٹاتے ہیں صاحب مقدور، محو حیرت کھڑے ہیں فرزانے
ناز تھا جن کی آشنائی پر، اب ہیں وہ مد و جزر بیگانے
ہائے وہ جرات آزما مانجھی، گم کہاں ہو گئے خدا جانے

میری ناقص رائے میں موجودہ دور اور حالات میں شاہ لطیف کے کلام کی اہمیت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ خدا اور رسول کے بعد شاہ لطیف کا فلسفہءِ حیات ہی ہے، جس کی بنیاد پر سندھی قوم زندہ ہے اور زندہ رہے گی، کیونکہ لطیف حق اور سچ کا پیمبر ہے اور ہر دور کا شاعر ہے۔

شاہ سائیں کے کلام کا ایک اہم پہلو ان کے کلام میں درسِ اتحاد ہے۔ اگر سنجیدگی سے دیکھا جائے تو ان کے کلام میں جابجا درسِ اتحاد نظر آتا ہے، ان کے کلام کا کوئی بیت یا مصرع ایسا نہیں آتا، جس میں سے انتشار کی بُو آتی ہو۔ شاہ صاحب، سندھی قوم کو متعدد مثالوں کے ذریعے اتحاد کی تلقین کرتے رہے۔ مندرجہ ذیل بیت میں کونج کو مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں:

آج اے کونج ہم صفیروں کو، کر رہی ہے اداس تیری یاد
تو نے دیکھے نہ وہ تہِ خاشاک، جال پھیلا گئے تھے جو صیاد
تجھے بینابیوں سے کیا حاصل، کون سنتا ہے اب تری فریاد
کر چکے ہیں شکار لاکھوں کو، وہ جفا پیشہ و ستم ایجاد
(شیخ ایاز، ص:408)

اس بیت میں شاہ صاحب حضرت انسان کو اپنوں سے فطری محبت کی اہمیت سے باخبر کرتے ہیں، جو اپنوں کو چھوڑ کر، دشمن کے دھوکے میں آکر، اپنی قوم و نسل کا وفادار نہیں رہتا۔ شاہ صاحب اس بھٹکے ہوئے کو ناصحانہ انداز میں اپنوں سے اتحاد کا درس دیتے ہیں۔

یوں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو شاہ سائیں کا کلام اتنا Diversified ہے کہ ہمیں زندگی کے ہر

شعبے اور معاملات سے متعلق اشعار نظر آئیں گے، اور ہر فکر اور ہر شعبہءِ زندگی سے تعلق رکھنے والا اُسے اپنا اور صرف اپنا، اپنی سوچ، فکر و مسلک کا شاعر سمجھتا ہے۔ ترقی پسند اُسے ترقی پسند، انقلابی اُسے انقلابی، صوفی انہیں صوفی، مذہبی انہیں مذہبی شاعر سمجھتے ہیں اور مانتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ترقی پسندی کے بھی کئی اقدار موجود ہیں، اگرچہ ترقی پسندی کی اصطلاح بیسویں صدی کی اصطلاح ہے، لیکن ترقی پسند ادب کی جتنی بھی لوازمات ہیں، وہ سب آج سے تین صدی قبل بھٹائی نے اپنے کلام میں سمو دی تھیں۔ شاہ صاحب نے بیداری کی آواز اور تبدیلیءِ حالات کی دعوت عام دی اور سمجھوتہ نہ کرنے کے لئے کہا ہے، بلکہ اپنی ہمت، اتحاد و یگانگت کے ذریعے تبدیلی کی بات کی ہے۔ وہ اجتماعیت کے قائل تھے اور کہتے ہیں:

آدمی میں بھی ہے مگر کمیاب، ان پرندوں میں جو اُخوت ہے
ایک ہی غول ایک ہی منزل، ہمسفر، راہبر محبت ہے
(شیخ ایاز، ص407)

بھٹائی محنت کشوں کی جدوجہد میں یقین مستحکم رکھتے تھے، وہ عوام کی حالت مسکینی، مجبوری اور سختیوں کی بات کر کے انہیں بیدار کرنا چاہتے ہیں اور ظلم سے ٹکرانے کے لئے ہمت دلاتے ہیں۔ وہ مارئی کے روپ میں مہر دوُر کے جابر حکمران کو خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کھال کو کھینچ کر نمک بھر دے، پھر بھی عہد وفا نہ توڑوں گی،
سانس جب تک ہے میرے سینے میں، پیارے ماروسے منہ نہ موڑوں گی
(شیخ ایاز، ص481)

کتابیات

1. سوڍر، شاھنواز، ڊاڪٽر، ’سنڌي ثقافت ۽ شاھ لطيف‘، شاھ عبداللطيف ڀٽ شاھ ثقافتي مرڪز، ڀٽ شاھ، 1991ع.
2. ڪاشف، محمد حسين، ’لطيف فڪر ۽ سُرن جي ساڃاھ‘، شاھ عبداللطيف ڀٽ شاھ ثقافتي مرڪز، ڀٽ شاھ، جولاءِ 2005ع.
3. ميمڻ، محمد سليم، پروفيسر، سھيڙيندڙ: ’شاھ عبداللطيف ڀٽائي جي پيغام جو موجوده حالتن تي اطلاق‘، ثقافت کاتو حڪومت سنڌ، مئي 2012ع.
4. ڀٽافي، شازيہ، ’سُر مارئي ۽ ڪاموڏ ۾ سماجي ۽ حڪومتي نظام ۽ شاھ جو مثالي رياست بابت تصور‘، ڪلاچي تحقيقي جرنل، جلد ستون، شمارو چوٿون، شاھ عبداللطيف ڀٽائي چيئر، ڪراچي يونيورسٽي، ڊسمبر 2004ع.
5. مظہر جمیل، ’شاہ عبد اللطیف بھٹائی کی شاعری میں انسانی جذبات و احساسات کا اظہار‘، (غیر مطبوعہ مقالہ)۔
6. سید، جعفر احمد، ڈاکٹر، ’شاہ عبد اللطیف بھٹائی کی شاعری اور فطرت‘، (غیر مطبوعہ مقالہ)۔
7. شیخ ایاز، اردو مترجم: ’رسالہ شاہ عبد اللطیف‘، سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد، اشاعت اول 1963ع۔
8. آغا سلیم، اردو مترجم ’شاہ جو رسالو‘ لوک ورثہ، اسلام آباد، 1992ع۔

نوٹ: یہ مقالہ زیبسٹ کے ’سندھ ابھیاس اکیڈمی‘ کی جانب سے منعقدہ ’شاہ لطیف اور عالمی امن کانفرنس‘ میں 22 مارچ، 2012ع میں پڑھا گیا۔

Shah Abdul Latif Bhitai Chair